مسلم خواتین اور انگلستان میں ''اسلامی طلاق''[2]

لوسی کیرل*

ربع صدی کے عرصے میں انگریزی قانون میں جو اہم تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں ان سے انگلستان میں رہائش پذیر مسلم شادی شدہ جوڑوں کی انگلش عائلی عدالتوں تک رسائی کے دروازے کھل گئے ہیں۔ ۱۹۷۳ء سے پہلے انگریزی عدالتیں ڈومیسائل کی بنیاد پر طلاق کے تنازعات کی سماعت کرتی تھیں۔ وہ افراد جو انگلینڈ میں رہائش پذیر تو تھے' لیکن ان کے پاس ڈومیسائل نہیں تھا وہ طلاق کے حصول کے لئے انگریزی عدالتوں سے رجوع نہیں کرسکتے تھے۔ ۱۹۷۲ء تک انگلش عدالتیں ''کثیر ازواجی'' کیسوں کی سماعت سے انکار کر دیتی تھیں۔ ڈومیسائل اور عائلی مقدمات کی کارروائی کے ایکٹ مجریہ ۱۹۷۳ نے عدالتوں کے اختیارات سماعت میں توسیع کرتے ہوئے انہیں طلاق کی ایسی درخواستوں کی سماعت کی بھی اجازت دے دی جن میں ڈومیسائل سے قطع نظر متعلقہ فریقین میں سے ایک فریق درخواست دینے سے پہلے برطانیہ میں ایک سال سے رہائش پذیر ہو۔

عائلی مقدمات (کثیر ازواجی) کے ایکٹ مجریہ ۱۹۷۲ء نے ازواجی ریلیف پر سے پابندی اٹھالی' جو قبل ازیں اس حوالے سے عائد تھی کہ غیر ملکی شادی امکانی یا حقیقی طور پر کثیر ازواجی شادی تھی اور ۱۹۸۳ء میں اپیلٹ کورٹ میں حسین بمقابلہ حسین مقدمے کے فیصلے میں یہ قرار پایا کہ انگلینڈ میں سکونت پذیر کسی مسلمان مرد کی غیر ملک میں شادی اس شک کی بنیاد پر کالعدم نہیں ہو سکتی کہ وہ امکانی طور پر کثیر ازواجی شادی ہے۔ عدالت نے واضح کیا کہ پاکستانی دلہن کو اپنے پرسنل لاء (اس کی جائے رہائش کے قانون یعنی پاکستانی مسلم لاء) کے تحت پہلے نکاح کی موجودگی میں ایک اور خاوند کرنے کی اجازت نہیں جبکہ خاوند کو اپنے پرسنل لاء (اس کی جائے رہائش کے قانون یعنی انگریزی قانون) کے تحت پہلی شادی کی موجودگی میں ایک اور شادی کی اجازت نہیں۔ عدالت کا استفسار تھا کہ اگر میاں یا بیوی میں سے کسی کو بھی ایک اضافی پارٹنر کی اجازت نہیں تو کثیر ازواجی کا ''احتمال'' کہاں موجود ہے؟

۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۳ء کی قانونی اصلاحات کے بعد انگلینڈ میں مقیم میاں بیوی میں سے کوئی بھی

*Lucy Carral, Journal of Muslim Minority Affairs, 1997 (تلخیص: سجاول خان رانجھا)

انگریزی عدالتوں کے ذریعے نان نفقہ حاصل کر سکتا ہے۔ اگر فریقین میں سے کوئی ایک کسی ایسے ملک میں سکونت پذیر ہو جہاں شادی کے لیے مسلم لاء نافذ العمل ہو' تو خاوند کی طرف سے اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ وہ عدالت میں جانے کی بجائے طلاق کا حق استعمال کرے یا بیوی کو خلع کی درخواست کی پیروی جاری رکھنے کی اجازت دے۔ بہر حال گذشتہ ربع صدی کے عرصے میں انگریزی قانون میں تبدیلیوں نے ایک طرف خاوند کی طلاق تک رسائی پر پابندیاں عائد کیں (یہ واضح رہے کہ انگریزی عدالت کے دائرہ سماعت میں ماورائے عدالت طلاق کا واقعہ انگریزی قانون کے مطابق شادی کے خاتمے میں موثر نہیں ہوگا) اور دوسری طرف بیرون ملک طلاق کے عمل کو تسلیم کرنے کے ضوابط کو قابل ذکر حد تک لبرل کیا (یعنی کسی ملک میں عارضی نہیں بلکہ شہریت یا مستقل سکونت پذیری کے حامل میاں یا بیوی میں سے کسی کے طلاق کے فیصلے کو تسلیم کیا)۔

یہ تبدیلیاں جوکہ زیادہ تر رعائتیں ہیں اور جو دوسری جنگ عظیم کے بعد کی کثیر ثقافتی نوعیت اور انگلینڈ میں ایک اچھی خاصی مسلم اقلیت کی موجودگی کے باعث طویل عرصے سے مطلوب تھیں، مسلمان مردوں کے مفادات کے ترجمانوں کی طرف سے ناخوشگوار ردعمل کا باعث بنیں۔ مسئلے کے بعض پہلوؤں کو یہاں زیر بحث لایا جارہا ہے۔

طلاق اور مسلم لاء

مسلم لاء کا ایک پہلو جو مغرب میں بہت معروف ہے اور جس پر وہاں تشویش پائی جاتی ہے وہ خاوند کو طلاق دینے کی آسان سہولت کا حق ہے۔ زبانی اظہار کے ایک سادہ سے فارمولے کے تحت خاوند شادی کو انجام تک پہنچا سکتا ہے۔ اگر خاوند سنی ہے تو وہ غیر اصلاح شدہ روایتی قانون کے تحت یہ کام فوری اور ناقابل رجوع صورت میں انجام دے سکتا ہے۔ اگر خاوند حنفی ہے (جیسے کہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی اکثریت ہے اور انگلینڈ میں زیادہ تر اسی خطے سے تعلق رکھنے والے افراد رہتے ہیں) اور اس نے طلاق کے الفاظ نشے یا سخت غصے کی حالت میں کہے یا اس کا مطلب وہ نہیں تھا یا اس کے اظہار کے فوراً" بعد وہ ان پر نادم ہوتا ہے تو اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔ نکاح طلاق کے ناقابل رجوع ہونے کی صورت میں ختم ہو جاتا ہے' تاہم ۱۹۶۱ء میں ایوب خان کی مارشل لاء حکومت نے پاکستان مسلم فیملی لاز آرڈی ننس نافذ کیا تھا' اس میں مسلمان خاوندوں پر ماورائے عدالت طلاق کی سہولت پر جوکم از کم پابندیاں عائد کی گئی تھیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ طلاق کی اطلاع ایک مقامی سرکاری افسر اور بیوی کے علم میں لائی جائے اور ایسی کسی اطلاع کی وصولی کے بعد ۹۰ دن سے پہلے یہ طلاق موثر نہیں ہوگی۔ اس عرصے میں

طلاق کا اعلان قابل رجوع ہوگا اور افسر متعلقہ کو اختیار ہو گا کہ وہ فریقین میں صلح صفائی کے لئے کوشش کر دیکھے' تاہم اس کی کوششوں میں ناکامی کی صورت میں طلاق ۹۰ دنوں کے بعد خود بخود موثر ہو جائے گی۔ مسلم فیملی لاز آرڈی ننس کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ جنوبی ایشیا میں حنفیوں میں فوری اور ناقابل رجوع تین طلاق' جو کہ قرآن میں طے کردہ طریقے سے مطابقت نہیں رکھتیں کو ایک قابل رجوع طلاق شمار کر لیا گیا ہے۔

پاکستانی قانون کے مطابق طلاق کے موثر ہونے کے لیے ضابطے کے چار تقاضے درکار ہیں۔

1۔ طلاق کے فارمولے کا اعلان

2۔ مقامی سرکاری افسر کو طلاق کے اعلان کا نوٹیفکیشن

3۔ طلاق کے اعلان کی بیوی کو اطلاع

4۔ نوے دن۔ جن میں خاوند اعلان کی واپسی سے اجتناب کرتا ہے۔

مذکورہ طریق کار جو پاکستانی قانون کے تحت طلاق کے موثر ہونے کے لیے لازم ہے' سے انگریزی عدالتوں کو اس نتیجے پر پہنچنے میں مدد ملی کہ پاکستانی طلاق جو دیگر ضوابط کار کے اصول کے تحت حاصل کی گئی ہے' غیر ملکی طلاق اور علیحدگی کے ایکٹ مجریہ ۱۹۷۱ء کے تناظر میں موثر ہے۔

انگریزی قانون میں طلاق کا ادراک

۱۹۷۱ء سے پہلے علیحدگی کے غیر ملکی قانونی نظام کے تحت انگریزی قانون واضح اور جامع تھا۔ یعنی اس میں فریقین کے ڈومیسائل (اس وقت اس سے خاوند کا ڈومیسائل مراد تھا) کے قانون کے مطابق طلاق کو انگریزی قانون میں جائز طلاق تسلیم کیا جاتا تھا۔ میاں بیوی کے ڈومیسائل کے قانون کے تحت طلاق کو حقیقی تصور کرتے ہوئے یہ بات سامنے آئی کہ انگلستان میں جو طلاق ماورائے عدالت دی گئی ہو اسے انگریزی قانون کے مطابق تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ کامن لا رولز میں ازدواجی وجوہ کے ایکٹ مجریہ ۱۹۷۳ء کے تحت ٹھوس تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں

(i) اس میں شق ۱۶ (۱) کے تحت جب تک قانون کی عدالت میں شادی کا خاتمے کا کیس داخل نہ ہو انگلینڈ میں کسی ایسے عمل کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

(ii) اگر کوئی جوڑا طلاق کی شق ۱۶ (۲) سے پہلے انگلینڈ میں ۱۲ ماہ سے رہائش پذیر ہو' تو عدالتی یا دیگر کارروائی سے ہٹ کر کسی اور طریقے سے حاصل کردہ طلاق کو تسلیم نہیں کیا جائیگا۔

(iii) شق ۱ کے تحت قانون میں بیوی کے ڈومیسائل کا انحصار ختم کر دیا گیا۔

اس بات کے اقرار کہ افراد مختلف ڈومیسائل کے حامل ہو سکتے ہیں (اب بیوی خود بخود شادی کی بنیاد پر خاوند کا ڈومیسائل حاصل نہیں کر سکتی) کا مطلب یہ ہے کہ اب اس کے بعد طلاق کو

صرف کامن لاء رول (فارن ڈومیسائل) کی بنیاد پر تسلیم کیا جائے گا۔ اگر وہ فریقین میں سے ہر ایک کے سکونتی قانون کے مطابق جائز ہو۔ تاہم فریقین میں سے اگر ایک فریق انگلینڈ میں سکونت پذیر ہو' تو فیصلے کو تسلیم نہیں کیا جائیگا۔

دریں اثنا غیر ملکی طلاق اور قانونی علیحدگی کا ایکٹ مجریہ ۱۹۷۱ء (جو کہ اس موضوع پر ہیگ کنونشن سے ماخوذ تاہم اس سے کہیں زیادہ آگے جاتا ہے) ایک ایسے ملک میں جس کے ساتھ ایک فریق شہریت' دوامی رہائش یا ڈومیسائل کے ذریعے منتھی ہو عدالتی یا دیگر قانونی طریقوں سے حاصل کردہ طلاقوں کو تسلیم کرنے کا ڈھانچہ فراہم کرتا ہے۔ ۱۹۷۱ء ایکٹ کے "کوڈ" سیکشن کے تحت غیر ملکی طلاق کو تسلیم کئے جانے کے (نظر ثانی شدہ) تقاضے کامن رولز کے مقابلے میں زیادہ نرم ہیں جو ۱۹۷۱ء کے ایکٹ کے تحت طے کئے گئے اور ۱۹۷۳ء کے ایکٹ کے تحت تبدیل کئے گئے۔

انگریزی قانون میں کسی غیر ملکی طلاق کو تسلیم کرنے کے معیار کے دو نمایاں ضوابط ہیں۔ اگر میاں بیوی میں سے کوئی ایک انگلینڈ میں سکونت پذیر ہے یا دونوں میاں بیوی (۱۹۸۶ء کے ایکٹ کے بعد دونوں میں سے کوئی ایک) طلاق کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے انگلینڈ میں ۱۲ ماہ تک مسلسل رہائش پذیر رہے ہوں تو اس صورت میں کامن لاء رولز کو استعمال میں نہیں لایا جاسکتا۔ ان دونوں رکاوٹوں میں سے ایک بھی ہیگ کنونشن کے نفاذ کے لئے کی گئی قانون سازی کے تحت غیر ملکی طلاق کو تسلیم کرنے سے نہیں روکتی۔

ماورائے عدالت طلاقوں یا شادیوں کی تحلیل کے اپنے ہی شہادتی مسائل ہیں۔ غیر ملکی طلاقوں کو تسلیم کرنے سے فوری مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ انگریزی عدالت کے دائرہ سماعت میں ضمنی امور نہیں' جب تک کہ وہ خود شادی کو ختم نہ کردے۔ چنانچہ شادی کے خاتمے کے سلسلے میں غیر ملکی طلاق کو تسلیم کرنے سے انگریزی عدالتیں مطلقہ بیوی کے حق میں مالیاتی احکامات جاری کرنے کے اختیار سے محروم ہو گئیں۔ اگرچہ یہ مشکل کسی بھی غیر ملکی علیحدگی کے فیصلوں میں پیش آسکتی ہے وہ چاہے عدالتی ہو یا ماورائے عدالتی لیکن یہ حسب توقع مسلم طلاقوں کے سلسلے میں ابھر کر سامنے آئی۔ اس کی وجہ مسلم قانون ہے جو طلاق میں نہ تو ازدواجی اثاثوں کی تقسیم اور نہ ہی بیوی کا نان نفقہ تسلیم کرتا ہے۔ انگلینڈ میں ایک مسلمان خاوند کے لیے شادی ختم کرنے کے لیے انگریزی عدالتوں سے رجوع کی بجائے طلاق سے کام چلانے کے پیچھے یہی خواہش کار فرماہے کہ وہ مطلقہ بیوی کے سلسلے میں کسی مالیاتی ذمہ داری سے بچ سکے۔

غیر ملکی طلاق یافتہ خواتین کے مفادات جنہیں لبرل انگریزی قانون میں تسلیم کیا گیا تھا' کے انگریزی عدالتوں کی طرف سے تحفظ میں ناکامی کو ازدواجی اور فیملی ضوابط ایکٹ' مجریہ ۱۹۸۴ء میں

مخاطب کیا گیا ہے۔ یہ قانون انگریزی عدالتوں کو اختیار دیتا ہے کہ وہ ایسے کیسوں میں جن میں کسی انگریزی عدالت کی طرف سے شادی کو ختم نہیں کیا گیا فریقین میں سے کسی کو مالی ریلیف مہیا کر سکے۔

انگلینڈ میں "بلیک میلنگ" کا شکار مسلم بیویاں

یہ کسی لحاظ سے بھی اتفاق نہیں تھا کہ جیسے ہی انگریزی عدالتوں کو ضمنی امداد فراہم کرنے سے متعلق اختیارات کا قانون پاس ہونے کے آثار واضح ہوئے جس کے تحت ایک غیر ملکی طلاق کو انگریزی قانون کے تحت قانونی تسلیم کر لیا گیا' مسلم مردوں کے مفادات کے ترجمانوں (جنہیں بہت سے حالات میں "بنیاد پرست" کی اصطلاح سے موسوم کرنا زیادہ درست ہے) نے موقف اختیار کیا کہ مسلم لاء کے تحت ایک مسلمان خاتون اپنے خاوند کی رضامندی کے بغیر طلاق کی اہل نہیں ہے اور یہ کہ کوئی بھی مسلم شادی "مذہبی" لحاظ سے ختم نہیں ہوسکتی جب تک کہ خاوند طلاق کا اعلان نہیں کرتا۔

اگرچہ یہ موقف مسلم قانون کے لحاظ سے درست نہیں ہے لیکن یہ آرتھوڈکس یہودی لاء میں عورت کی پوزیشن سے بہت قریب ہے۔ چنانچہ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ یہودی قانون کے ساتھ مشابہت کے باعث انگریزی قانونی حلقوں میں اسے بغیر کسی تنقیدی جائزے کے قبول کر لیا گیا۔ مسلم قانون کے تحت ایک مرد کئی بیویاں رکھ سکتا ہے لیکن ایک عورت صرف ایک خاوند سے شادی کر سکتی ہے۔ چنانچہ ایک مسلمان عورت جو اپنے عقیدے کے مطابق دوبارہ شادی کی خواہشمند ہے' کے لیے مذہبی طلاق ضروری ہے' تاہم ایک مسلمان مرد سول طلاق پر بھی اکتفا کر سکتا ہے۔ کیونکہ جتنی بار وہ شادی کرنا چاہے اس پر مذہبی لحاظ سے کوئی ممانعت نہیں ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں دلہنیں ایسی ناخوشگوار صورتحال سے دوچار ہیں۔ وہ اپنے خاندوں کی بلیک میلنگ کی زد میں رہتی ہیں۔ خوش قسمتی سے مجوزہ قانون سرکاری وکیل کی طرف سے اس پر مزید غور و خوض کے لیے واپس لے لیا گیا۔ لیکن بد قسمتی سے جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔

یہودی طلاق اور مسلم خاتون

مسلمان جوڑوں کے حقوق کے درمیان غیرمتفقہ طلاق کے حصول کے سلسلے میں بڑا فرق یہ ہے کہ جہاں خاوند بیوی کی رضا مندی کے بغیر طلاق کا اعلان کرکے بڑی آسانی سے علیحدگی اختیار کر سکتا ہے' ایک بیوی جس کا خاوند علیحدگی پر رضامند نہ ہو یا وہ ایسی شرائط پر جنہیں اس کی بیوی قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو' کو عدالت میں جانا پڑتا ہے۔ مسلم فقہ کے تمام مکاتب فکر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ بیوی کو اس بات کا حق ہے کہ وہ شادی کے خاتمے کے لئے عدالت

سے رجوع کر سکتی ہے۔ ایسی عدالتی علیحدگی اتنی ہی حتمی ہے جتنی کہ خاوند کی منظوری اور اجازت کے ساتھ ماورائے عدالت "مذہبی طلاق"۔

ایک مسلمان عورت کن متعین وجوہ کی بنا پر عدالت کے ذریعے شادی ختم کرنے کی مستحق ہے' اس بارے میں اسلامی قانون کے مختلف مکاتب فکر میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ روایتی حنفی مکتب فکر اس سلسلے میں سب سے زیادہ سخت ہے۔ ٹھیک یہی وجہ ہے کہ روایتی حنفی قانون میں جامع اصلاحات ۱۹۱۵ء میں سلطنت عثمانیہ کی ابتدائی اصلاحات کے تعارف کے بعد کئی ممالک میں مکمل ہوئی ہیں۔ چونکہ انگلینڈ میں مسلمانوں کی اکثریت کا تعلق جنوبی ایشیا سے ہے' اس پہلو سے مسلمان مردوں کے مفادات کے ترجمانوں کے دعووں کی تکذیب کے لیے مسلم میرج ایکٹ مجریہ ۱۹۳۹ء پر نظر ڈالنا ضروری ہے یہ بل اب نصف صدی سے زائد عرصے سے پاکستان' بنگلہ دیش اور ہندوستان کے قوانین کا حصہ ہے۔ اس کے مقاصد اور وجوہ میں کہا گیا ہے:

"حنفی فقہ میں ایسی کوئی شق نہیں ہے جو ایک مسلمان عورت کو اجازت دیتی ہو کہ وہ اپنے خاوند کی طرف سے اسے نظر انداز کرنے یا اس کے ساتھ بے وفائی' مسلسل بدسلوکی یا کچھ اور صورتوں میں شادی ختم کرنے کے لیے عدالت سے فیصلہ حاصل کرسکے۔ کسی ایسی شق کے فقدان کے باعث برطانوی ہندوستان میں لاتعداد خواتین کو ناقابل بیان مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ حنفی قانون دانوں نے واضح طور پر کہا ہے کہ ایسے کیسوں میں جن میں حنفی فقہ کا اطلاق مشکل پیدا کرتا ہے مالکی' شافی یا حنبلی فقہ کے اطلاق کی اجازت ہے۔ اس پالیسی پر عمل کرتے ہوئے علماء نے فتوے جاری کئے کہ اس بل کی شق ۳ حصہ الف (ماحصل بل کی دفعہ ۲ میں موجود) کے تحت ایک شادی شدہ عورت شادی کے اختتام کے لیے فیصلہ حاصل کرسکتی ہے۔ اس اصول کی روشن مثال مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کی کتاب al-Halat al-Najiza میں موجود ہے۔ مولانا نے مالکی فقہ کا گہرا مطالعہ کیا ہے جس کا ہندوستان کے حالات کے تحت ایسے کیسوں پر اطلاق ہو سکتا ہے۔ اس کی منظوری بہت بڑی تعداد میں علماء نے دی ہے کیونکہ عدالتوں کے لئے کسی غیر مالکی خاتون پر مالکی فقہ کے اطلاق کے سلسلے میں جھجک موجود ہے' اس لیے مذکورہ بالا اصول کے ادراک اور نفاذ کے لیے قانون سازی کی ضرورت ہے تاکہ بے شمار مسلم خواتین کے مصائب کو کم کیا جاسکے"۔

اس قانون کا پس منظر اس لحاظ سے بہت دلچسپ ہے کہ یہ انگریزی دور میں ایسے حکمرانوں کی طرف سے بنایا گیا' جو بالعموم اپنی رعایا کے پرسنل لا میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔ برطانوی ہندوستان کے منفرد حالات میں چند مایوس حنفی خواتین نے ازدواجی زندگی کے ناقابل برداشت حالات سے نکلنے کا راستہ نکالا اور وہ (چاہے عارضی طور پر ہی سہی) مرتد ہونے کا اعلان تھا۔ فقہ

حنفی کے مطابق شادی شدہ جوڑے میں سے کسی ایک فریق کے مرتد ہونے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے۔ تاہم مرتد خاتون کو تب تک نظر بند رکھا جاتا جب تک کہ وہ اپنی غلطی پر توبہ تائب نہ ہو جاتی' اس کے بعد اس کا نکاح اسی مرد کے ساتھ کم حق مہر پر کر دیا جاتا۔

برطانوی ہندوستان میں ارتداد کوئی جرم نہیں تھا۔ بلاشبہ عیسائی مشنری بڑی سرگرمی کے ساتھ مذہب تبدیل کرنے والوں کی تلاش میں تھے اور ایو نجلیکل لابی مضبوط تھی۔ اقلیتوں کی نااہلیت کے ازالے کا ایکٹ مجریہ ۱۸۵۰ (جو فریڈم آف ریلیجن ایکٹ کہلاتا تھا) کا کریڈٹ اسی موخرالزکر گروپ کو جاتا ہے۔ اس ایکٹ میں واضح کیا گیا کہ مرتد اپنے سابقہ حقوق (بالخصوص جائیداد اور وراثت کے حقوق) سے مذہب یا ذات برادری کو چھوڑنے یا اس میں سے نکالے جانے سے محروم نہیں ہوتا۔

کسی حد تک غیر منطقی بات کہ برطانوی ہندوستان کی عدالتوں کو جب اس مسئلے کا سامنا کرنا پڑا تو ان کے فیصلے کے مطابق اگرچہ ارتداد کے قانون کا غالب حصہ برطانوی ہندوستان میں قابل اطلاق نہیں' مسلم قانون کا وہ حصہ جو مرتد کی شادی کے خاتمے کی تصدیق کرتا ہے بہر حال نافذ العمل ہے۔ چنانچہ ایک مسلمان خاتون عیسائیت اختیار کرکے اپنے خاوند سے جس کو وہ ناپسند کرتی تھی آسانی سے پیچھا چھڑا سکتی تھی اور اس نے اکثر ایسا کیا اور مقصد پورا ہونے کے بعد وہ دوبارہ اسلام میں داخل ہوجاتی۔

اگرچہ ایسی عورتوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی لیکن ایسے کیسوں کی اردو پریس میں بڑے پیمانے پر تشہیر ہوتی جس سے مسلمانوں میں تشویش پھیل جاتی۔ چنانچہ یادداشتوں اور درخواستوں کے ذریعے حکومت پر زور دیا گیا کہ وہ عدالتوں کی طرف سے مسلمان خواتین کے مرتد ہونے کی آڑ میں شادی ختم کرنے کے فیصلوں کو منسوخ کرے۔ حکومت اس ضمن میں کوئی اقدام کرنے میں اس وقت تک متذبذب تھی جب تک وہ ایسی خواتین کے لیے جو ارتداد کو ازدواجی ریلیف کے لیے استعمال کرتی تھیں کوئی متبادل علاج تلاش نہ کرلیتی۔ دریں اثنا سرکردہ علماء نے فتویٰ جاری کیا جس میں تجویز کیا گیا تھا کہ حنفی خواتین کو دیگر سنی مکاتب فکر بالخصوص مالکی مکتب فکر میں دی گئی وجوہ کی بنا پر طلاق حاصل کرنے کا استحقاق فراہم کیا جائے۔

۱۹۳۹ء کا ایکٹ یقیناً" ایک سمجھوتا ہے۔ اس میں مسلم خواتین کو مختلف وجوہ کی بنا پر طلاق کے لیے درخواست دائر کرنے کی اجازت تھی (جنہیں مالکی فقہ سے اختیار کیا گیا تھا) جبکہ اس کے ساتھ یہ بھی قرار دیا گیا کہ ایک شادی شدہ مسلم عورت کے ارتداد سے اس کی شادی کے خاتمے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا(دفعہ ۴) قانون کی دفعہ ۲ میں ان وجوہ کا ذکر ہے جن میں سے ایک یا ایک سے زائد کی بنیاد پر جنوبی ایشیا کی مسلم خواتین عدالت میں طلاق کے لیے دعویٰ دائر کر سکتی

ہیں۔
(۱) اس کا خاوند پچھلے چار سالوں سے لاپتہ ہو۔
(۲) اس کے خاوند نے اسے دوسال کے لئے نظر انداز کیا ہو یا وہ اسے نان نفقہ فراہم کرنے سے قاصر رہا ہو۔
(۳) خاوند کو سات سال یا اس سے زائد عرصے کے لیے قید کی سزا سنائی گئی ہو
(۴) خاوند معقول وجہ کے بغیر تین سال سے ازدواجی ذمہ داریاں پوری کرنے سے قاصر رہا ہو۔
(۵) خاوند شادی کے وقت جنسی لحاظ سے کمزور ہو اور وہ ایسا ہی رہے۔
(۶) خاوند دو سال سے پاگل ہو یا اسے جذام کا مرض لاحق ہو یا وہ مہلک امراض خبیثہ میں مبتلا ہو۔
(۷) اس کی شادی پندرہ سال کی عمر سے پہلے اس کے باپ یا سرپرست کی طرف سے کی گئی ہو اور یہ اٹھارہ سال ہونے سے پہلے منسوخ کردی گئی ہو' بشرطیکہ ان میں خلوت کا عمل وقوع پذیر نہ ہوا ہو۔
(۸) یہ کہ خاوند کی طرف سے بیوی کے ساتھ ظالمانہ سلوک روا رکھا جاتا ہو یعنی
(الف) اس پر حملے کی پختہ عادت یا ظالمانہ طرز عمل سے اس کی زندگی اجیرن بنا دینا۔ چاہے یہ طرز عمل جسمانی دست درازی کی صورت میں نہ بھی ہو۔
(ب) بری شہرت رکھنے والی عورتوں کے ساتھ وابستگی رکھتا ہو یا وہ بری شہرت کی زندگی گزار رہا ہو۔
(ج) اسے وہ غیر اخلاقی زندگی گزارنے پر مجبور کرے۔
(د) اس کی جائیداد ٹھکانے لگائے یا اسے اپنی جائیداد پر قانونی حقوق کے استعمال سے روکے۔
(ر) اسے اپنے مذہبی عقائد و اعمال پر عمل پیرا ہونے کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرے۔
(س) اگر اس کی ایک سے زائد بیویاں ہوں اور وہ قرآنی احکامات کے مطابق ان سے عادلانہ سلوک روانہ رکھتا ہو۔
(ش) یا کوئی ایسی وجہ جو مسلم قانون میں شادی کے خاتمے کے لیے جائز تسلیم کی جاتی ہو پاکستان اور بنگلہ دیش میں مسلم فیملی لاز آرڈی ننس ۱۹۶۱ء میں مزید اصلاح کی گئی اور اس میں عورت کے لیے طلاق کے حصول کی ایک وجہ یہ بھی شامل کی گئی کہ مصالحتی کونسل کی پیشگی اجازت کے بغیر "خاوند نے مسلم فیملی لاز آرڈی ننس مجریہ ۱۹۶۱ء کی خلاف ورزی

کرتے ہوئے ایک اور شادی کرلی" یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۱۹۳۹ء کے ایکٹ کی نوعیت عمومی اطلاق کی ہے اور یہ پاکستان، بنگلہ دیش اور ہندوستان میں مسلم خواتین، وہ حنفی، شافعی، سنی یا شیعہ ہوں سب پر یکساں لاگو ہوتا ہے۔
مسلم شادیوں کی تنسیخ کے ایکٹ کے تحت ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش کی عدالتوں کی طرف سے طلاق کی اجازت دیتے ہوئے خاوندوں کی منظوری یا رضامندی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس لحاظ سے مسلم خواتین کی پوزیشن یہودی مذہبی قانون agunah سے مختلف ہے، جس کے تحت خاوند کے انکار کی صورت میں عدالتی طلاق کے حصول کے باوجود آرتھوڈکس جیوش لا کے مطابق عورت "شادی شدہ" ہی متصور ہوگی۔ چنانچہ اس بات کا قطعی کوئی جواز نہیں ہے کہ انگلینڈ میں رہائش پذیر مسلم خواتین کو برصغیر میں ان کی دیگر نسلوں کے مقابلے میں مسلم قانون کی زیادہ بنیاد پرستانہ یا کم روشن خیال تعبیر کا نشانہ بنایا جائے یا انگلینڈ میں مسلم عورتوں کو ان حقوق سے محروم رکھا جائے جن سے ان کی بہنیں برصغیر میں نصف صدی سے زائد عرصے سے بہرہ ور ہو رہی ہیں۔

اختتامی رائے

اس بات کی فوری ضرورت ہے کہ اعتدال پسند اور تعلیم یافتہ مسلمان ایک غیر مسلم فضا میں مسلم قانون کے سوال میں دلچسپی لیں۔ یہ یقیناً" ناقابل قبول بات ہے کہ انگلینڈ جیسے ملک میں عورتوں کو جہالت اور سماجی دباؤ کے تحت مجبور کیا جائے کہ وہ اسلامی قانون کی ایک ایسی تعبیر قبول کر لیں جو اس سے کہیں زیادہ سخت ہے، جس سے جنوبی ایشیا میں عورتوں کو واسطہ پڑتا ہے۔ اہم بات جو ذہن میں رکھنے کے قابل ہے وہ ہندوستان کے ایک سرکردہ مسلم اسکالر کے الفاظ میں یوں بیان کی گئی ہے کہ "حقیقی اسلامی قانون اصل میں جس بات کا حامی ہے وہ اس وقت طلاق کی "بریک ڈاؤن" تھیوری کہلاتی ہے"۔ ربع صدی قبل ایک سرکردہ مسلم قانون دان سندھ کے چیف جسٹس طیب جی نے شادیوں کے فسخ کے ایکٹ کی تشریح ان الفاظ میں کی: "شروع ایام سے مسلمان خواتین کو طلاق حاصل کرنے کا حق میسر رہا ہے۔ جب یہ بات واضح ہوئی کہ فریقین "اللہ کی حدود" میں نہیں رہ سکتے (۱)۔ شادی میں تعطل وقوع پذیر ہو چکا ہو (۲) شادی کا تسلسل بیوی کے لیے نقصان دہ ہو..... اس کی وجوہ ۱۹۳۹ء کے ایکٹ ۸ کے سیکشن ۲ کی ضمنی شقوں ایک سے 4 تک میں درج ہیں جو اس اصول پر مبنی ہیں کہ شادی معطل ہو کر رہ گئی ہو، جس سے اس کے خاتمے کا جواز بنتا ہو اور ضمنی شقوں ۵ سے ۸ تک میں یہ اصول کار فرما ہے کہ شادی کا ایسے کیسوں میں جاری رہنا بیوی کے لیے نقصان دہ ہو"

اس صورت میں جج نے درخواست گزار بیوی کو اس بنیاد پر طلاق کی اجازت دے دی کہ خاوند دو سال کی قانونی مدت کے دوران اس کی خبر گیری نہ کر سکا۔ اگرچہ اس عرصے میں اس کی بیوی قانونی وجوہ کے بغیر اس سے الگ رہ رہی تھی (یعنی وہ خودہی علیحدہ تھی اور جب تک وہ ازدواجی گھر میں دوبارہ شامل نہ ہوتی وہ اپنے خاوند سے نان نفقے کا مطالبہ نہ کر سکتی تھی) جج کا نقطۂ نظر تھا کہ اس طرح سے علیحدہ رہنا اور فریقین کا اپنے اختلافات کو دور نہ کرسکنا شادی کے مکمل خاتمے پر دلالت کرتا ہے۔ انگلینڈ کی عدالت میں طلاق کی خواہشمند عورت کو یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ شادی "ناقابل اصلاح حد تک ناکارہ" ہو چکی ہے۔ ناکارگی کو ثابت کرنے کے لیے عورت کو ان باتوں میں سے ایک کو لازماً سامنے لانا ہوتا ہے (I) بدکاری سے وابستہ مزید ایسے حالات جس میں وہ مدعاعلیہ کے ساتھ رہنا ناممکن سمجھتی ہے (II) مدعاعلیہ نے اس کے ساتھ کچھ اس طرح سے سلوک کیا ہو کہ درخواست گزار مدعاعلیہ کے ساتھ معقول طریقے سے رہنے کی توقع نہ رکھتی ہو (III) دو سال سے گمشدگی(IV) دوسال سے علیحدگی' جبکہ فریقین طلاق پر رضا مند ہوں یا (V) پانچ سال سے علیحدگی۔ یہ غالباً اس لسٹ سے بہت مختصر ہے جو ایک مسلمان بیوی کو مسلم میرج کی تنسیخ کے ایکٹ کے تحت جنوبی ایشیا میں میسر ہے۔

یہاں فوری نکتہ جس کی اہمیت ہے یہ ہے کہ ان وجوہ میں کس حد تک مماثلت ہے جن کی بنیاد پر ایک مسلمان عورت انگریزی عدالت سے طلاق حاصل کر سکتی ہے اور اسکی ایک بہن ہندوستانی' پاکستانی یا بنگلہ دیشی عدالت سے طلاق حاصل کر سکتی ہے۔ بہرحال دریں اثنا انفرادی طور پر مسلم خواتین جو ذاتی کردار کی قوت اور مذہبی عقیدے سے لیس اور اپنا ذاتی موقف بھی رکھتی ہیں' وہ معاشرے کو مزید لبرل اور انسانی سمت میں آگے بڑھا سکتی ہیں۔ جنوبی ایشیا کی ان خواتین کی طرح جنہوں نے اپنے خاوند سے چھٹکارے کے لیے ارتداد کا سہارا لیا جو اس سے کم سخت اقدامات سے ممکن نہیں تھا۔ مسلم میرج کی تنسیخ کے ایکٹ مجریہ ۱۹۳۹ء کی منظوری کا سہرا انہی خواتین کے سر بندھتا ہے۔